’’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘‘: نوآبادیاتی تناظرات کا اینگلو انڈین ثقافتی مرقع

"Kai Chand thy Sar e Asmaan": Anglo-Indian cultural contexts in colonial contexts

ڈاکٹر عذرا پروین [i]

Abstract:

The effects of the neo-demographic period on the civilization and society of common India can be clearly seen, which have been presented as important topics by Indian/Pakistani historians. Along with these historical contexts, the common culture born in this period has been coming to us as an important subject of Urdu fiction. Fiction in its place is an important medium of completing the incomplete pages of history. "Kai Chand The Sar-e-Asman" is such a novel by Shams ur Rahman Farooqi, through which the cultural and social life of the neo-colonial era can be closely observed. Thus, the best means of understanding history is available in the language of fiction. The article under consideration brings forward the same cultural and colonialism of the neo-demographic period.

Keywords: *Urdu Novel, Colonialism, Indo-Islamic Civilization, Cultural Heritage, Mughal Era, Wazir Khanum, Cultural Variations, Civilization Education.*

مشترکہ ہندوستان کی تہذیب اور سماج پر نو آبادیاتی دور کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں ، جنہیں ہندوستانی /پاکستانی مورخین نے اہم موضوعات کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ اس دور میں جنم لینے والا مشترکہ کلچر بھی اردو افسانے کا ایک اہم موضوع بن کر ہمارے سامنے آتا رہا ہے۔ افسانہ اپنی جگہ تاریخ کے ادھورے صفحات کو مکمل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ کائی چند سرِ آسمان شمس الرحمن فاروقی کا ایک ایسا ناول ہے جس کے ذریعے نوآبادیاتی دور کی تہذیبی اور سماجی زندگی کو قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح تاریخ کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ افسانے کی زبان میں دستیاب ہے۔ زیر نظر مضمون نو آبادیاتی دور کی اسی ثقافتی اور استعماریت کو آگے لاتا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو ناول ، تنقید ، نوآبادیات ، استعماریت ، ہند اسلامی تہذیب ، ثقافتی مرقع ، مغل عہد ، وزیر خانم ، ثقافتی تغیرات ، تہذیب آموزی۔

متنوع ادبی جہات کے حامل شمس الرحمٰن فاروقی اُردو ادب کا ایک ایسا معتبر حوالہ ہیں جن کا ساٹھ اور ستر کی دہائی کے بعد اُردو ادب میں جنم لینے والے نئے ادبی تنقیدی مباحث اور معیارات میں کلیدی کردار رہا ہے بالخصوص اپنے رسالے ’’شب خوں‘‘ کے ذریعے اردو ادب میں جدیدیت کے مباحث اور نئے تخلیقی تجربوں کے حوالے سے اُن کا کردار نہایت اہم اور کلیدی ہے تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اُردو کے ایک جید نقاد کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں اور ناولوں کی بدولت اب افسانوی دُنیا میں بھی اپنی علیحدہ اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ یوں تو ان کی تمام افسانوی نثر مجموعی طور پر (افسانے اور ناول) گنگا جمنی تہذیب کے خدوخال سے پروان چڑھتے سیاسی و سماجی تموجات، معاشی و اقتصادی صورت حال نیز ادبی و تہذیبی روایات

[i] صدر نشین ، شعبہ اُردو ، دی ویمن یونی ورسٹی ، ملتان (Corresponding Author)

کے ساتھ ساتھ بر صغیر میں نوآبادیاتی کلچر کی آمد اور قدیم تمدنی زندگی کی رُخصتی کا اعلان کرتی ہے۔ تاہم ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" کو اس ساری صورت حال کا تخلیقی نقطۂ عروج قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ ناول اُن کی تخلیقی صلاحیتوں، تاریخی و تہذیبی شعور اور لسانی صلابت و استحکام کا منہ بولتا ثبوت پیش کرتا نظر آتا ہے جس میں وہ ایک زرخیز پس منظر کے ساتھ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر اور اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے بدلتے ہندوستان بالخصوص دلی کی تہذیبی جھلکیاں پیش کرتے ہیں نیز ناول میں بر صغیر کی قدیم کلاسیکی ادبی و تہذیبی روایات اور زندگی کی بازیافت کو فریضہ سمجھتے ہوئے اس طور مجسم و متحرک کیا گیا ہے کہ یہ ناول اُس عہد کا ایک لازوال اور دلکش تہذیبی مرقع بن گیا ہے۔

زیر نظر مقالہ شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول "کئی چاند تھے سرِ آسماں" میں اٹھارویں صدی عیسوی کے اختتام اور انیسویں صدی عیسوی کے آغاز کے بر صغیر میں قائم ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر سایہ قائم ہوتی نوآبادیات کے استعماری ہتھکنڈوں اور تحقیری رویوں کو یہاں کی تبدیل ہوتی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تاریخی صورت حال کے تناظر میں پیش کر رہا ہے نیز نوآبادیاتی عہد میں انیگلوانڈین تہذیب کے خدوخال بھی نمایاں کر رہا ہے۔

"کئی چاند تھے سرِ آسماں" پہلی بار ۲۰۰۶ء میں شہرزاد پبلی کیشنز کراچی سے شائع ہوا (بعد ازاں اس کے متعدد ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہوئے، جو اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا منہ بولتا ثبوت ہیں)۔ ناول کے پہلے صفحے پر احمد مشتاق کا یہ مصرع درج ہے:۔

"کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے"

۸۱۸ صفحات کا یہ ناول تقریباً ۷۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ ناول کا مرکزی کردار وزیر خانم ہے جو یوسف سادہ کار کی غیر معمولی حسن اور منفرد عادات کی مالک چھوٹی بیٹی ہے تاہم ناول میں اس کی بڑی اور منجھلی بہنیں بھی زمانے کے عمومی چلن کے مطابق زندگی گزارتی اور مختلف مقامات پر اپنی روایتی چھب دکھاتی نظر آتی ہیں۔

وزیر خانم کے خاندانی پس منظر کو اُس کے والد یوسف سادہ کار کی زبانی بیان کیا گیا ہے جو بتاتا ہے کہ بنیادی طور پر اُس کے آباء و اجداد کا تعلق کشن گڑھ سے تھا۔ کشن گڑھ کہ جو مصوری اور دل کش شبیہیں بنانے

میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا نیز اس علاقے کی خوشحالی و معیشت کا راز بھی یہاں کی دلکش و حسین شبیہیں تھیں۔ تاہم یہ شبیہیں خیالی ہوتی تھیں کہ اس وقت وہاں حقیقی شبیہیں بنانا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن ایک بار اس علاقے میں اسی یوسف سادہ کار کا پردادا مخصوص اللہ ایک ایسی شبیہ بنا بیٹھا جو گاؤں کے زمین دار مہاراول گجندر سنگھ کے غیض و غضب کا باعث بنی کیوں کہ 'گجندر سنگھ کی سپاہ کے سامنے ایک گانجا پینے والے نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ مخصوص اللہ کی بنائی ہوئی شبیہ سترہویں صدی کے والئ کشن گڑھ کی محبوب ملکہ ''بنی ٹھنی'' کی تصویر نہیں ہے بلکہ یہ تو خود گجندر سنگھ کی چھوٹی بیٹی ''من موہنی'' کی حقیقی شبیہ ہے جس کی خوبصورتی اس علاقے میں ضرب المثل تھی۔ اس ناکردہ جرم کی پاداش میں جہاں ایک طرف مہاراول غم و غصے میں بیٹی کو مخصوص اللہ کے حجرے کے سامنے لا کر اس کا سر تن سے جُدا کر دیتا ہے وہیں مخصوص اللہ کے پورے گاؤں کو بھی جلاوطن کر دیتا ہے۔ ناول میں اُسی مخصوص اللہ کے پڑپوتے یوسف سادہ کار کی بیٹی اپنی بے مثال خوبصورتی اور وقار و تمکنت کے بجث بنی ٹھی کا روپ دکھائی دیتی ہے۔

وزیر خانم بر صغیر کے ایک منفرد و ممتاز نسوانی خصوصیات کا حامل کردار ہے اور اپنی جگہ حیران کُن بھی کہ ایک طرف تو وہ بغیر نکاح کے پہلے مارسٹن بلیک اور بعد ازاں نواب شمس الدین کے ساتھ اپنے اختیار و مرضی سے جنسی تعلق و روابط اُستوار کرتی ہے اور یکے بعد دیگرے تین اولادوں کو جنم دیتی ہے جب کہ دوسری طرف وہ ایسی تنک مزاج ہے کہ اپنی مرضی کے خلاف کسی دوسرے مرد کی نسبت و تعلق کی خواہش کو رد کرنے کی اپنے اندر جرأت بھی رکھتی ہے گویا وہ آزاد و خود مختار ہے لیکن اُس کی آزادی میں وقار و تمکنت کی جھلک کو بھی بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔

مارسٹن بلیک وزیر خانم کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے جو اسسٹنٹ پولیٹکل ایجنٹ کی آسامی پر متعین ایک خوشحال سب آفیسر ہے اور وزیر خانم کے ساتھ بھرپور زندگی گزارتا نظر آتا ہے لیکن جب وہ راجپوتانے کی سازشوں کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن جاتا ہے تو بے سروسامانی کے عالم میں (محبت اور توجہ کے فقدان کے باعث) دہلی کا رُخ کرنے والی وزیر خانم کی زندگی میں نواب شمس الدین آتا ہے۔ اجمال اس کہانی کا یہ ہے کہ ناول نگار نے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' میں ان کرداروں، وزیر خانم اور بعد ازاں نواب شمس الدین کے توسط سے سترہویں صدی کے اختتام اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں بر صغیر میں نوآبادیات قائم

 ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

کرنے والے برطانوی تاجروں اور حکمرانوں کے استعماری رویوں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً اسی لیے اس ناول کو دہلی کی دم توڑتی تہذیب و معاشرت کا شاندار کا مرقع بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بقول انتظار حسین:

> ”مدتوں بعد اُردو میں ایک ایسا ناول آیا ہے جس نے ہندو پاک کی ادبی فضا میں ہلچل مچا دی ہے۔۔۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بطور ناول نگار خود کو منکشف کیا ہے اور مورخ فاروقی یہاں پر ناول نگار فاروقی کو پوری پوری کمک پہنچا رہا ہے۔۔ ’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘ کچھ الگ طرح کا ناول ہے۔ ہم اسے زوال آمادہ مغلیہ سلطنت کے آخری برسوں کی دستاویز کہہ سکتے ہیں۔“[۱]

کشن گڑھ، رام پور اور دہلی کی تہذیب و معاشرت نیز سیاسی، سماجی انتشار اور مغلیہ سلطنت کے زوال کی داستان و بے بسی کے بیان کو تاریخی شہادتوں کی کمک پہنچاتی اس دستاویز کو تاریخی ناول بھی قرار دیا جاتا ہے تاہم خود شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا اصرار مختلف ہے:

> ”یہ بات واضح کر دوں کہ اگرچہ میں نے اس کتاب میں مندرج تمام تاریخی واقعات کی صحت کا حتی الامکان اہتمام کیا ہے لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔ اسے اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب اور انسانی تہذیبی و ادبی سروکاروں کا مرقع سمجھ کر پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔“[۲]

ناول میں وزیر خانم کے توسط سے مارسٹن بلیک کا ہندوستانیوں سے متعلق حقارت آمیز رویہ، جس کے باعث وہ ہندوستانیوں کو غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب قرار دیتا ہے درحقیقت نوآبادیات قائم کرنے والے گوروں کے استعماری رویوں اور استحصالی ہتھکنڈوں کی ادبی دستاویز فراہم کرتا ہے۔

کہانی کے کرداروں کے ذریعے استحصالی ہتھکنڈوں کی افسانوی عکس گری کا جائزہ لینے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم نوآبادیات، استعماریت اور اجارہ داری کی مبادیات کو ان کے تناظرات میں سمجھیں۔

عام طور پر نوآبادیات جس کا لغوی مفہوم نئی بستیاں یا نئی آبادیاں قائم کرنا ہے، قائم کرنے والوں

کو استعمار کار کا نام دیا جاتا ہے۔ جو دوسرے علاقوں میں جا کر نئی آبادیاں قائم کرتے اور اس طور اپنی اجارہ داری قائم کرتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں مقامی لوگ اپنے وسائل کے حوالے سے مجبورِ محض بن کر رہ جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی کے حوالے سے بھی ان نوآبادکاروں/استعمار کاروں کی نظر عنایت کے مرہون منت نظر آتے ہیں۔ اسی لیے اب عام طور پر انگریزی اصطلاح Colonialism کو Imperialismکے مترادف سمجھا جانے لگا ہے۔اِس ضمن میں ڈاکٹر احتشام علی کولنز کوبلڈ ڈکشنری میں درج تاریخ کے مطابق نوآبادیاتی صورت حال کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”نوآبادیاتی صورت حال ایک ایسا عمل ہے جس کے تحت ایک طاقتور ملک اپنے سے کمزور ممالک پر اجارہ حاصل کر کے ان کے جملہ وسائل کو اپنی دولت اور طاقت میں اضافے کے لیے استعمال کرتا ہے۔“[۳]

جب کہ نوآبادیات کے حوالے سے خود ڈاکٹر مبارک علی یہ تعبیر پیش کرتے ہیں:

> ”کولونیل ازم کا اُردو ترجمہ نوآبادیات کیا جاتا ہے اس اصطلاح کو رومیوں نے استعمال کرنا شروع کیا تھا جب وہ دوسرے ملکوں یا علاقوں پر قبضہ کرتے تھے تو اپنے اقتدار اور تسلط کو قائم رکھنے کے لیے وہاں اپنی نوآبادیاں قائم کر لیتے تھے۔ اس قسم کی نوآبادیاں قائم کرنے کا رواج تقریباً ان تمام امپیریل طاقتوں میں رہا تھا، جو غیر علاقوں کو اپنے ماتحت کرتے تھے۔ تاریخ میں جہاں اور چیزیں بدلتی ہیں وہاں الفاظ کے معنی بھی اپنا مفہوم بدل لیتے ہیں۔ اس وجہ سے اب کولونیل ازم یا نوآبادیات کی اصطلاح کو غیر ملکی اقتدار، قبضہ اور تسلط کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔“[۴]

ناصر عباس نیرّ کولونیل ازم اور امپیریل ازم کے حوالے سے اس عمومی رویے کے حامی نہیں ہیں کہ اس ذیل میں وہ بھی ایڈورڈ سعید کے مؤقف کی تائید کرتے نظر آتے ہیں جن کے نزدیک دونوں میں تاریخی رشتہ ضرور موجود ہے مگر دونوں ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔ یہ الگ بات کہ خود وہ بھی کولونیلزم کو امپیریل ازم ہی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن مترادف کہنے سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ اُن کے نزدیک امپیریل ازم اپنی امپائر کو قائم کرنے یا اپنی محدود سرزمین سے باہر ممکن حد تک وسعت پانے کے لیے محض سیاسی اطاعت کی طالب ہوتی ہے، اپنی محکوم آبادیوں کو ثقافتی طور پر مغلوب کرنے کی کوشش نہیں

کرتی۔ ان امپائرز کے اپنی محکوم آبادیوں پر ثقافتی، لسانی اور مذہبی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں تاہم ان میں جبر و سختی یا دوسروں کو مسخ کرنے کے عناصر نہیں ہوتے اُن کے نزدیک یہ عناصر نوآبادیات کا خاصہ ہیں جو اپنے طاقت اور اختیار کو مستقل وسعت دینے کے لیے محض سیاسی اطاعت شعاری کو کافی نہیں سمجھتی بلکہ ان سے ثقافتی اطاعت شعاری کی بھی خواہاں ہوتی ہے۔[۵] یہی رویہ بر صغیر میں آباد اُن نوآبادکاروں کا تھا۔

دراصل نئی بستیاں آباد کرنے والے اِن آباد کاروں میں کمزور اور زیر دست اقدام کے املاک و وسائل پر ناجائز قبضے اور استعمار زدہ اقدام و افراد کے قلب و اذہان کو اپنی لپیٹ میں لے لینے کی طول پکڑتی خواہش اس قدر فزوں ہو جاتی ہے کہ استعمار کار مقامی لوگوں کی تہذیب و تمدن، عادات و اطوار، اخلاقی و سماجی رویوں بلکہ بعض اوقات تواُن کے مذہبی عقائد سے جُڑی رسومات پر بھی اثر انداز ہونے کی مربوط کوششیں کرنے لگتے ہیں جسے وہ تہذیب آموزی یا فلاحی مشن کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مقامی لوگوں کے اذہان اور انتقامی کاروائیوں کو اپنے قابو میں لاتے ہوئے نیز معاشی فوائد حاصل کرنے کی کوشش میں وہ مفتوحہ علاقوں کے بااثر افراد سے قریبی تعلق بھی قائم کرتے ہیں بلکہ ناصر عباس نیرّ تو اس ضمن میں مابعد نوآبادیاتی مطالعہ کی اہمیت کی وضاحت کے باب میں یہاں تک کہتے ہیں:

> ”نوآبادیات کا قیام بڑی حد تک یورپ یا مغرب کی مرکزیت کے قیام، انجذاب اور استحکام کا مرہونِ منت تھا۔ یورپ یا مغرب کا علم، نظامِ حکمرانی، تعلیمی تصورات، ثقافتی مثالیہ اور آفاقی قرار دیے گئے تھے اور نوآبادیوں میں اُنھیں پھیلانے اور رائج کرنے کی کوشش کی۔“[۶]

یورپی استعماری ممالک اپنی نوآبادیوں سے متعلق ایسی خوش نما کہانیاں واساطیری تصویریں پیش کرتے اور اُنھیں نصابات کے ذریعے پھیلاتے جو سننے میں خوش نما، ترغیب آمیز اور ناگزیر محسوس ہوتے مگر وہ حقیقت میں غلبہ پسند تھے تاہم وہ اپنی غلبہ پسندی کو مخفی رکھتے تھے۔ یقیناً یہی وجہ تھی کہ وہ ہندوستان میں اپنی آمد کو مشن (نصب العین) قرار دیتے تھے جن کا مقصد یہاں کے لوگوں اور ملک کی دگرگوں صورت حال سدھارنا تھا اور اسے وہ تہذیب آموزی کا نام دیتے تھے نتیجتاً یہ بیانیے بعد ازاں ان بیشتر مقامی لوگوں کو پُرکشش، دل فریب اور ناگزیر محسوس ہونے لگے۔[۷]

غلبہ پسندی کو مخفی رکھنے کی جو ایک توجیہ ڈاکٹر مبارک علی بیان کرتے ہیں اُس کا خلاصہ کچھ یوں

ہے کہ چوں کہ ہندوستان پر انگریزوں نے مرحلہ وار قبضہ کیا تھا لہٰذا ابتدائی دور میں ان کا رویہ جارہانہ نہ تھا بلکہ ہندوستان کی سرزمین اپنے وسائل اور آسودہ معاشی صورتحال کے سبب اُن کے لیے کشش و رومان رکھتی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں اپنے قیام کے ابتدا میں اُنھوں نے مغلوں کی رویات اور عادات و اطوار نیز پسند و ناپسند کو اپنائے رکھا لیکن بعد ازاں اُن کا رویہ مدرسری سماج سے تبدیل ہوتے پدرسری نظام کی صورت بدلتا گیا یعنی جس طرح ابتدا میں مرد نے عورت کو فریضۂ تخلیق سے عہدہ برآہی کے سبب تخلیقی ارتقاء کے عمل میں اُسے دیوی اور خدا کا پرتو قرار دیتے ہوئے اُس کی تعظیم کی تھی لیکن جوں جوں اُس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی گئی کہ وہ تو خود بھی اس تخلیقی عمل کا ایک لازم کردار ہے تو توں توں اُس کی حاکمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اس لیے ابتدا میں ہندوستان سے متعلق کشش و رومان کے احساسات رکھتے انگریز جیسے جیسے اپنی تنظیم سازی سے معاشی استحکام حاصل کرتے گئے ویسے ویسے مقامی لوگوں غیر متمدن اور غیر مہذب سمجھنے لگے۔ یقیناً اسی سبب انھوں نے خود کو ہیرو کے روپ میں پیش کرنا شروع کیا نیز اپنی من پسند لکھوائی گئی تاریخوں میں مغلوں کے زوال و انتشار کو اس طور پیش کیا کہ مقامی لوگوں کو یقین آجائے کہ انگریز حکمران یہاں کے انتشار، بدعنوانی اور کس مپری کو اپنے حسنِ انتظام سے خوشحالی کی راہ پر گامزن کرنے کے خواہاں ہیں۔[۸]

جہاں تک شمس الرحمٰن فاروقی کے ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' میں یورپی استعاری رویوں اور سترہویں، اٹھارویں صدی میں مشترکہ ہند اسلامی تہذیب کی پیشکش کا تعلق ہے تو بجا طور پر یہ ناول اُس عہد میں نوآبادیاتی تناظرات کا اینگلو انڈین زندہ ثقافتی مرقع ہے۔ کشن گڑھ کا علاقہ ہو یا دہلی کی تہذیبی زندگی، مرزا غالب، امام بخش صہبائی، استاد ابراہیم ذوق، نوجوان شاعر مرزا داغ دہلوی کی شعری مجالس ہوں یا اینگلو انڈین تہذیب میں ڈھلتا ہندوستانی سماج، ایسٹ انڈیا کمپنی کے نمائندہ کرداروں مارسٹن بلیک اور ولیم فریزر کے مقامی ثقافت کے حوالے سے حقارت آمیز مخصوص رویے ہوں یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتی آزادانہ خیالات کی حامل خود مختاری سے فیصلے کرتی وزیر خانم، مقامی لوگوں کے توہمات ہوں یا مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے محل میں پروان چڑھتی سازشیں وغیرہ، یہ سب کے سب ناول میں محض سپاٹ تاریخی حوالے ہی نہیں بلکہ اُس عہد کی تہذیبی زندگی کی زندہ اور متحرک تصاویر بھی ہیں۔

ڈاکٹر مبارک علی نے بھی اپنی کتاب 'آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان' میں بڑی تفصیل کے ساتھ اُن

انگریز تاجروں کا ہندوستان کی تہذیب و ثقافت میں مدغم ہونے اور اُس کا فخریہ حصہ بننے کا احوال پیش کیا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ دولت کے ارتکاز کے سبب مغلیہ طبقے نے جس طور شاندار حویلیاں، باغات اور عمارات تعمیر کروائیں یا لباس کی آرائش، سواریوں کے اہتمام اور کھانے پینے کی جاذبِ نظر عادات اختیار کی ہوئی تھیں، انگریزوں نے بھی اُن سب طور طریقوں قبول کیا۔ ایک تو ایسا کرنا وہ اس لیے بھی ضروری سمجھتے تھے کہ دراصل وہ جس طبقے سے تجارتی مراعات کے خواہاں تھے وہ اُن کے معیار کو حاصل کیے بغیر انھیں ناممکن لگتا تھا۔ دوسرا یہ بھی تھا کہ اپنے ملک و ثقافت سے دوری کے باعث پیدا ہونے والے خلا کو بھی وہ ہندوستان کی ثقافتی سرگرمیوں میں شرکت سے پُر کر سکتے تھے۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے حکام و عوام دونوں کی زبان فارسی اور اُردو کو سیکھنے کی کوشش کی[۹] تاہم ناول و تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ جس عنصر نے اس اخذ و استفادے میں قربت و انسلاک کو واضح رُخ عطا کیا وہ خود ان انگریز افسروں کا مقامی عورتوں سے شادی بیاہ یا جنسی تعلق اُستوار کرنا تھا کیوں کہ سفری اخراجات سے بچنے کے لیے ابتدا میں تو کمپنی نے اپنے افسروں اور ملازمین کو یہ اجازت دے رکھی تھی۔ وہ مقامی عورتوں سے جنسی روابط و بیاہ قائم کر سکتے ہیں۔ ناول میں حسن و ادا کی مالک وزیر خانم سے تعلق قائم کرنے والے مارسٹن بلیک کو بھی اپنے گھر میں اجارہ داری پر مبنی کم و بیش سبھی ترامیم قبول و گوارا تھیں کہ وہ ہر حال میں وزیر خانم کے ساتھ اپنے تعلق کو (خواہ بغیر شادی کے ہی سہی) قائم و بحال رکھنا چاہتا تھا ماسوا اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچوں کی تربیت کے (کہ اس ذیل میں اُس کا رویہ بھی دوسرے فرنگی مردوں جیسا متعصب و تنگ نظر تھا جو ہندوستانیوں کو قابلِ نفرت سمجھتے تھے)۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے سوفیہ اور مارٹن بلیک کی تربیت کی ذمہ داری اپنے رشتے کے ان نصرانی ٹنڈل بہن بھائیوں کو سونپ دی تھی جو نہ صرف ان بچوں کو مذہب عیسائیت کا پکا پیروکار بنانا چاہتے تھے بلکہ اپنی تنگ نظری کے سبب دیگر مذاہب سے یک گونہ نفرت بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا گاہے بگاہے ولیم ٹنڈل کی بہن تو وزیر خانم کے سامنے اس بات کا بھی اعادہ کرتی رہتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ نہ صرف اوپر سے بلکہ اندر سے بھی کالے ہوتے ہیں کیوں کہ اُسے وزیر خانم کا کھلتا سانولا رنگ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا لہٰذا بقول متکلم وہ دل ہی دل میں منصوبے ترتیب دیتی رہتی کہ کسی طرح ممکن ہو تو وہ اپنے گورے بھائی کو اس دیسی بی بی کی پہنچ سے چھڑوا کر کسی سچی، نیک اور سفید رنگ مسیحی لڑکی سے بیاہ دے جب کہ ولیم

ٹنڈل اپنی بہن کے متعصب رویے کے مقابلے میں وزیر خانم کو ذرا مختلف لگتا تھا تاہم اُس کے حوالے سے بھی وزیر خانم کو جو یقین راسخ تھا وہ یہ تھا کہ :۔

”سب فرنگی ایک سبھاؤ کے نہیں ہوتے لیکن سب میں ایک طرح کی رعونت، ایک انداز تبختر، حاکمی کا احساس مشترک ہوتا ہے۔“[۱۰]

بلکہ اگر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس حوالے سے تو وزیر خانم، خود پر جان چھڑکنے والے مارسٹن بلیک کے رویے سے بھی نالاں وملول تھی کہ مارسٹن بلیک اُس کی قوم سے نفرت و کراہت محسوس کرتا ہے۔ انھیں کام چور، بدنیت، فضول رسوم کا عادی اور حرام کا جنا سمجھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ بیٹی کی پیدائش کے بعد مارسٹن بلیک نے وزیر خانم کو بیٹی کا ہندوستانی نام ”بادشاہ بیگم“ بھی اُس کی بے تحاشا خفگی و ناراضی کے بعد رکھنے دیا تھا ورنہ وہ تو محض ایک نصرانی نام کے علاوہ (سوفیہ) کچھ سُننے کو تیار ہی نہ تھا۔

اخذ و استفادے اور ایک دوسرے کی عادات و تہذیب پر اثر انداز ہونے کی یہی صورت ہمیں وزیر خانم اور مارسٹن بلیک کے ہاں بھی نظر آتی ہے:

”ہر انگریز گھر میں لیموں (اور گرمیوں میں برف) کی وافر مقدار اور ”سوڈا واٹر“ کی بوتلیں موجود رہتی تھیں۔ ایک مدت تک تو اُس نے ”سوڈا واٹر“ ہاتھ سے بھی نہ چھوا، اس شک میں کہ حرام نہ ہو۔ بڑی مشکل سے اُس نے مارسٹن بلیک کی قسموں پر یقین کیا کہ یہ صرف پانی ہے جس میں ہوا بھر دی گئی ہے۔ اسی طرح اُسے شبہ تھا کہ اُس کی آمد سے قبل گھر میں لحم خوک بھی آتا ہوگا۔ لہٰذا مارسٹن بلیک سے پوچھے بغیر اُس نے پہلے ہی دن سارے برتن منجوا اور دھلوا کر ان پر آب زمزم کا چھڑکاؤ کیا جس کی ایک کپی وہ اپنے ساتھ بطورِ خاص لیتی گئی تھی اور مارسٹن بلیک سے کہہ دیا کہ اب اس گھر میں موئے ناپاک بنڈیلے کا نام بھی لیا گیا تو میں زہر کھالوں گی۔ مارسٹن بلیک نے اُس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اُسے اپنی آغوش میں تقریباً بھینچتے ہوئے کہا کہ ”وزیر خانم، تم وزیر نہیں، اس گھر کی ملکہ ہو۔ تم جو کہو گی وہی ہوگا۔“[۱۱]

اس ذیل ناول اگر دیکھیں تو میں وزیر خانم کا مارسٹن بلیک کے ساتھ جنسی انسلاک و تعلق بھی کار معمول لگتا ہے جس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت مسلمان لڑکی اور عیسائی لڑکے کی شادی کو قانونی حیثیت حاصل

تھی۔ پھر حرم رکھنے کی جو روایت ہندوستان کے طبقہ امراء میں تھی اُسے انگریزوں نے بھی اختیار کیا ہو تھا کہ اُس وقت یہ چلن طبقاتی و سماجی بلندی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ناول میں جن دو تین معروف بدیسی کرداروں کا بار بار ذکر ملتا ہے، ان کے حرم بھی خواتین سے معمور تھے۔ مثلاً معروف کردار اکٹر لونی (المعروف بہ اختر لونی) کے حرم میں دیگر خواتین کے علاوہ تیرہ بیویاں تھیں۔ اسی طرح اینگلو انڈین اسکنر کہ جو ایک راجپوت کے بطن سے پیدا ہوا تھا (اسی باعث گوروں کی نظر میں خالص یا نسلی نہیں تھا نیز دیگر گوروں کی نسبت کمپنی میں دیگر ملازمین سے کم تر رتبہ رکھتا تھا)، کے حرم میں بھی چودہ (۱۴) عورتیں تھیں۔ ریذیڈنٹ دہلی چارلس مٹکاف کی بیوی بھی ہندوستانی تھی۔ ان ہندوستانی عورتوں سے تعلق و نسبت اور شادیوں کے باعث یہ انگریز ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے براہ راست اثر میں آگئے اور ان کے گھروں میں ہندوستانی کھانوں کا رواج ہوتا گیا لہٰذا ہندوستانی جاگیر دار معاشرے کی تقلید میں اقتدار پاتے ہر انگریز افسر کے گھر میں بھی ملازموں کی ایک فوج (کم ترین اُجرت پر) ہوا کرتی تھی۔ [۱۲]

تاریخ شاہد ہے کہ یہاں کی اشرافیہ اور جاگیردارانہ سماج کی تقلید و اثر پذیری کے تحت انگریز افسروں کے پاس بھی محافظوں کے دستے اور گھوڑے، ہاتھی، پالکیوں اور گاڑیوں کی بہتات ہوا کرتی تھی۔ فوجوں اور سواروں کا یہ دستہ نیزوں اور بندوقوں سے لیس ہوتا تھا۔ اس پر مستزاد ان بدیسی افسروں نے مغل امراء کے درباروں کے مجلسی آداب اور مشاغل بھی اختیار کر لیے تھے۔ مشاعروں میں شریک ہونا اور یہاں رائج اُردو فارسی زبان کی آموزش بھی اِسی کا حصہ تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر احتشام لکھتے ہیں:

> ”نوآبادیات کی بنیاد رکھنے کے لیے استعمار کاروں نے اپنی کالونیز میں جہاں ابتدائی طور پر ہارڈ پاور کا بے مہابا استعمال کیا، وہیں اپنے اجارے کو مستحکم کرنے کے لیے ’سافٹ پاور‘ کو بھی بطور طاقت استعمال کیا۔ مغربی استعمار کار اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ مقامی باشندوں کی فطرت، اُن کی ثقافت، تہذیب اور کلچر کا وسیع تر شعور ہی وہ بنیادی نکتہ ہے، جو ایشیا، افریقہ اور دوسرے خِطوں پر اجارے کی کلید ہے۔“ [۱۳]

اسی طرح کی ایک شعری محفل کا احوال اس ناول کی بھی زینت بنتا ہے جس میں مارسٹن بلیک کے قتل کے بعد وزیر خانم ولیم فریزر کی ڈیوڑھی کے منعقدہ مشاعرے میں شریک ہوتی ہے۔ ولیم فریزر کی اس

ڈیوڑھی عالیہ، واقعہ پہاڑی میں شعر و سخن کی اس محفل میں مرزا غالب کو بھی شرکت کرتے دکھایا گیا ہے۔ جہاں سے ہمیں وزیر خانم کا مشاعرے میں شریک نواب شمس الدین سے آئندہ ملاقاتوں اور وزیر خانم پر فریفتہ ولیم فریزر کے جذبۂ حسد و رقابت کو ہوا دیتا سلسلہ ملتا ہے۔ اپنے حرم کو نوخیز لڑکوں اور خوبصورت اداؤں کی حامل خواتین سے سجانے والا ولیم فریزر بھی وزیر خانم کے حسن و ادا پر دل و جان سے فریفتہ ہو جاتا ہے جبکہ وزیر خانم تو نواب شمس الدین کو اس طور دل دے بیٹھتی ہے کہ نواب صاحب کے نکاح سے انکاری ہونے کے باوجود بھی اُن سے رشتہ و انسلاک کی خواہاں ہوتی ہے اور آئندہ یہی بات نواب شمس الدین پر ولیم فریزر کے عتاب کا باعث بننے کے لیے کافی ثابت ہوتی ہے۔ فی الوقت موضوع کی پیش نظر مشاعروں کے انعقاد اور ہندوستانی تہذیب و رنگ ڈھنگ اختیار کرنے والے ولیم فریزر کے بارے میں ناول نگار کا یہ بیان بڑا اہم ہے کہ سابق حکمران اختر لونی صاحب کی طرح ولیم فریزر نے بھی ہندوستانی طور طریقے اپنا لیے تھے نیز وہ ہندوستانی کلچر سے متعلق اہم چیزیں یعنی حقہ، پان اور عطریات وغیرہ کا شوقین تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے فارسی اور ریختہ میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اُس کی نشست و برخاست کے آداب امرائے ہند جیسے تھے۔ اِسی لیے اس کے دیوان خانے میں فرنگی طرز کے صوفے اور کوچ کے بجائے قالین، گاؤ تکیے اور گدے موجود رہتے تھے تاہم ہندوستانی کلچر سے اس قدر وابستگی و دل بستگی ظاہر کرنے والے ولیم فریزر کا مقامی باشندوں سے رویہ بہت ذلت آمیز تھا۔ جس کا بڑا نشانہ خود نواب شمس الدین تھے جن کی ہتک و تذلیل کا وہ کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا اور اسی دشمنی کے باعث ہی بے پناہ اختیارات کے حامل ولیم فریزر نے کلکتہ کے نواب گورنر جنرل بہادر کو نواب شمس الدین کی انتظامی معاملات کی بابت منفی رپورٹس بھجوائیں تاکہ وہ اُنھیں نااہل و بے اصل ثابت کر کے اُن کے سوتیلے بھائیوں، نواب امیر الدین اور نواب ضیاء الدین کو ان کی آبائی ریاست کا صحیح حقدار ثابت کر سکے۔ حالانکہ یہی ولیم فریزر اور بعد ازاں اِس کے قتل میں نواب شمس الدین کو مجرم ثابت کر کے معاون بننے والا اینگلو انڈین جیمز اسکنر، ماضی میں نواب شمس الدین کے والد نواب احمد بخش کا دوست تھا اور اُن کا آپس میں بہت یارانہ تھا۔ اسی سبب ہی نواب شمس الدین کے والد نواب احمد بخش نے جب بلی ماراں میں اپنی نئی حویلی بنوائی تھی تو اُس پر دوستی کی لاج نبھاتے ہوئے جیمز اسکنر صاحب بہادر کا نام کندہ کروایا تھا لیکن اب یہی جیمز اسکنر ولیم فریزر کے قتل کیس میں نواب شمس الدین کے

ISSN:2708-5724, E-ISSN:2708-5732

خلاف کمپنی کا بڑا معاون اور سہولت کار بنا ہوا تھا جبکہ خود کمپنی کے بدیسی گوروں کے نزدیک یہ اینگلو انڈین جیمز اسکنر، خالص خون بھی نہیں تھا نیز انگریزوں سے وفاداری نبھانے کے باوجود دیگر انگریز افسروں کی نسبت انگریزی فوج میں اُس کا عہدہ یہ تھا کہ وہ بمشکل کارگذار کپتان تھا یعنی Acting Caption۔ جسے اُس نے بڑے تگ و دو کے بعد حاصل کیا تھا۔ گویا جن انگریز دوستوں کو نواب احمد بخش اپنا دوست اور خیر خواہ سمجھتے تھے اور جنہیں مغل بادشاہ کی جانب سے مختلف خطاب بھی ملے ہوئے تھے کیونکہ وقت و حالات کے بدلتے ہی اُن میں رعونت آگئی تھی اور اب جیمز اسکنر کو بھی کمپنی کی نوکری اور وفاداری عزیز تھی جس میں اُسے کئی مقامی لوگوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔

وزیر خانم کو ہی دیکھ لیں، مارسٹن بلیک کہ جو وزیر خانم کے ہندوستانیوں کو چور، نکما اور حرام کا جنا کہتا ہے، سے جھگڑے کے باوجود وزیر خانم مارسٹن بلیک کی اس بات پر فریفتہ نظر آتی ہے کہ وہ دوسرے انگریز افسروں کی نسبت مارسٹن بلیک کی توجہ کا اکیلی مرکز ہے، کوئی دوسرا اس میں حصہ دار نہیں ہے۔ اسی لیے تو ڈاکٹر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> "نوآبادیاتی نظام میں قبضے اور اجارے کی صورتحال اتنی سیدھی نہیں ہے، یہاں جنگی حربوں کے ساتھ ساتھ ایسے ذہنی اور ثقافتی حربوں کو بھی بروئے کار لایا جاتا ہے جن کے نتیجے میں مقامی باشندے محض جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی غلام بن جاتے ہیں۔"[۱۴]

یہاں ایک سوال یہ بھی جنم لیتا ہے کہ ابتدا میں مقامی ثقافت کو اپنانے والے اور مغل بادشاہت سے خلعت و جاگیر والقابات پانے والے اور ہندوستانی تہذیب کے سحر میں خود کو مبتلا ظاہر کرنے والے انگریز آفیسر یکایک کیوں مقامی لوگوں سے بے زاری کا اظہار کرنے لگے تھے کہیں ایسا تو نہیں کہ تجارتی مراعات سے حاصل شدہ منفعت و اختیار نے اُنھیں وہ رعونت عطا کر دی تھی جس کے باعث انہوں نے ہندوستانیوں کو حقیر اور کم تر گرداننا شروع کر دیا تھا کیوں کہ محض یہ نواب شمس الدین کو لوہارو کے علاقہ اور اس کے ماتحت پرگنہ جات سے محرومی نیز بھرے بازار میں ولیم فریزر کا نواب شمس الدین کی بہن جہانگیرہ بیگم کا نام لے کر ہاتھ مانگنے تک کا معاملہ نہ تھا جو نواب صاحب کے غصے اور انتقام کا باعث اور ولیم فریزر کے قتل کا سبب بنتا ہے بلکہ ڈاکٹر مبارک علی کے نزدیک بھی انگریزوں کا ہندوستانیوں سے غیریت اور دوری اختیار

کرنے والا معاملہ کمپنی کے استحکام سے مربوط ہے جس کے باعث ان لوگوں نے عام آبادیوں سے دُور الگ اپنے علاقے آباد کرنا شروع کر دیے تھے اور مقامی باشندوں سے جدا ہو کر رہنا شروع کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب مستحکم کمپنی کے سبھی انگریز افسر اپنی برتری اور مقامی لوگوں کی ہتک کو روزمرہ زندگی کے معمولات میں شامل رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور یقیناً ولیم فریزر کے قتل کے بعد (محض شک و شبہ کی بنیاد پر) نواب شمس الدین کے ملازم کریم خاں کی ذلت آمیز سزا کمپنی کے اہل کاروں کو مطمئن کرنے کے لیے ناکافی تھی لہٰذا وہ نواب شمس الدین کو بھی تختہ دار تک پہنچانے کے درپے تھے حالانکہ اس ذیل میں نہ تو نواب شمس الدین کے حوالے سے انگریز سرکار کو کوئی شہادت موصول ہوئی تھی اور نہ ہی حراست میں لیے جانے والے کریم خان نے اپنے اور نواب صاحب کے حوالے سے ولیم فریزر کے قتل کی بابت منہ کھولا تھا مگر اس کی باوجود مَن چاہے فیصلے کے حصول کے لیے کمپنی کے ملازمین کا کریم خان سے ذلت آمیز رویہ اور گفتگو ملاحظہ فرمائیں:

> ''قتل کے وقت تم کہاں تھے اور کیا کر رہے تھے؟'' لارنس نے بالآخر پوچھا۔
> ''سرکار میں کیا بتاؤں؟ قتل کس وقت ہوا مجھے نہیں معلوم''
> لارنس کے اشارے پر ایک جمعدار نے کریم خان کے سر، گردن اور پیٹھ پر کئی سونٹے بہت تول تول کر ایک ایک دو دو ثانیہ کے وقفے سے لگائے۔ کریم خان کا سارا اوپری دھڑ لہو سے بھر گیا۔ پھر لارنس نے کہا:
> ''حرامی کتے۔ گستاخی مت کرو نہیں تو اس سے بھی بُرا حال ہوگا۔ بائیس مارچ کی شام سے صبح تک تم کہاں تھے۔''[۱۵]

اغلب یہی ہے کہ ہماری پولیس بھی جرم اگلوانے کے لیے انگریز سرکار کی اِسی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہے کیوں کہ ایسی بہت سی ذلت آمیز سلوک پر مبنی باقیات اس بات پر شاہد دیکھائی دیتی ہیں۔ اس مقدمے کی بابت بھی کریم خان اور نواب شمس الدین پر عدالت میں جرح کی جاتی ہے۔ نواب صاحب کے خلاف کوئی شہادت موصول نہ ہونے کے باوجود جان لارنس چارلس مٹکاف کے سامنے یہ استدلال رکھتا ہے کہ چوں کہ دونوں کے درمیان آقا اور نوکر (Master and Servent) کا رشتہ ہے لہٰذا انگریزی قانون کے مطابق نوکر کے ہر کام کا ذمہ دار اُس کا آقا اور مالک قرار دیا جا سکتا ہے حالانکہ یہ صورت حال تو انگریزی قانون

میں دیوانی مقدمات و معاملات میں مانی جاتی تھی، فوجداری معاملات پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا لیکن چوں کہ قانون اُن کا تھا لہٰذا تشریح کا حق بھی اُنھی کے پاس محفوظ تھا۔ نواب شمس الدین کے وکیل مرزا اسفند یار بیگ کے پاس اس قانون کا کوئی توڑ نہ تھا ماسوائے اس کے یہ نظریہ نہ اِسلامی شرح میں تھا اور نہ مغل قانون میں اور نہ ہی اہل ہنود کی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر تھا مگر افسوس کہ نواب صاحب کی وکیل کی یہ دلیل انگریزی قانون کے سامنے ناقص تھی لہٰذا کریم خان کی پھانسی کے چند دن بعد نواب شمس الدین کی سزا (پھانسی) کو بھی بحال رکھا جاتا ہے۔ مزید ظلم یہ کہ جب اس سزا کی سماعت و عمل درآمد کے وقت بھی نواب شمس الدین کے قدم نہیں ڈگمگاتے تو گورے آفیسرز کا تحمل و ضبط جواب دے جاتا ہے اور وہ بھڑک اُٹھتے ہیں لہٰذا پھر وہ نواب صاحب کو گالیوں سے نوازتے ہیں۔ خیر یہ احوال تو معززین دہلی و نواح دہلی میں آباد شرفا کا تھا اب ذرا مغل دربار کے اندر اور عمائدین خواص کا رخ کرتے ہیں اُن کی کسمپرسی و بے بسی کو زیر بحث لاتے ہیں۔ جس کے باعث بآسانی دیکھا جا سکتا ہے کہ محل کی اندرونی سیاست میں بھی یہ لوگ کس قدر دخیل تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہادر شاہ ظفر کے چاروں بیٹوں بالترتیب دارابخت عرف میراں ہاشمی (ولی عہد)، میرزا شاہ رخ بہادر (وزیر اعظم و مختار علی) میرزا کیومرث (ولی عہد دوم) اور میرزا محمد سلطان فتح الملک بہادر (ولی عہد سوم) کے حوالے سے وراثت و مناصب کا تعین بھی یہی گورے کرتے نظر آتے ہیں جو ابتدا میں بادشاہِ وقت سے تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لیے ہندوستانی تہذیب و ثقافت میں مدغم ہونے کی کوشش کرتے تھے اور لباس و آرائش، سواریوں کے اہتمام نیز کھانے پینے میں ان جیسی عادات اختیار کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے لیکن اب صورت حال کی تبدیلی پر ابو ظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ ثانی کی تخت نشینی کا وقت اور مدت طے کرنے والے بھی وہی تھے۔ یہ فیصلہ بھی انہی کا تھا کہ حکمران کا بڑا بیٹا ولی عہد اور تاج و تخت کا وارث ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ناول میں میرزا دارابخت کی ولی عہدی کا اعلان ٹامس مٹکاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس میں درحقیقت یہ پیغام پوشیدہ تھا کہ مقامی شہزادگان یا بادشاہ وقت اپنے تئیں ولی عہدی یا بادشاہی کے لیے کوشش نہیں کر سکتے۔ اسی لیے اب انگریز سرکار نے اہل ہند کو یہ بھی باور کروانا شروع کر دیا تھا کہ اہل ہند جن باتوں کے دلدادہ ہیں اور جن خیالات کی روش میں وہ اپنا جادۂ حیات از خود روشن و منور پاتے ہیں وہ باتیں اب غلط اور ازکار رفتہ کا درجہ حاصل کر چکی ہیں۔ یقیناً اِسی زور و شور سے

وارد ہوتی تبدیلی کی آواز سن کر ہی میرزا فتح الملک بہادر عرف مرزا فخر الدین، فخرو اِس بات کا شعور رکھتے اور انگریزی زبان سیکھتے نظر آتے ہیں۔

خود غرضی اور اخلاقی بدحالی کا یہ حال ہے کہ انگریز سرکار کے طے شدہ فیصلے کے مطابق بادشاہت ولی عہد اول میرزا دار بخت کو ملنی تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جب بادشاہ کے دونوں بڑے بیٹے بوجود لقمہ اجل بن جاتے ہیں تو بادشاہ کی منظورِ نظر چھوٹی بیگم یعنی نواب زینت محل اپنے بیٹے شاہ فریدوں کی ولی عہدی کے نہ صرف خواب دیکھتی ہے بلکہ ان محلاتی سازشوں میں وہ چارلس مٹکاف صاحب اور قلاں بہادر کو چپکے چپکے تحفے تحائف بھی بجھواتی اور ان کی ضیافتوں میں بھی مشغول نظر آتی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان صاحب بہادر لوگوں کو اپنے موافق کرکے میرزا فخر، کے بجائے اپنے سگے اور بادشاہ کے چھوٹے بیٹے کی ولی عہدی کا پروانہ جاری کرا سکے۔

چوں کہ مغل بادشاہت بھی رفتہ رفتہ اب لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی لہٰذا تاریخ شاہد ہے کہ کمپنی کی سیاسی طاقت کو مستحکم کرنے والے کمپنی کے عہدے دار بادشاہ کو کمپنی کا وظیفہ خوار سمجھنے لگے تھے۔ مذکورہ بالا محلاتی سازشوں اور آپسی نفاق کے نتیجے میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب بادشاہ کو دیے گئے وظیفے کو کمپنی بار سمجھنے لگی تھے لہٰذا کمپنی کے آفسران بادشاہت کے ادارے کو ہی ختم کرنے کے درپہ تھے انگریزوں نے تو مرزا فخرو کی ولی عہدی بھی اس شرط پر قبول کی تھی کہ بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کی موت کے بعد بادشاہت ختم ہو جائے گی اور قلعہ معلی خالی کر دیا جائے گا۔[۱۶] اِس کے باوجود نواب زینت محل کا اپنے بیٹے شاہ فریدوں کی ولی عہدی کے حوالے سے سازشیں کرنا حرص و ہوس، خود غرضی اور اخلاقی دیوالیہ پن کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ شاید اسی لیے فیروز عالم لکھتے ہیں:

> ”یہ وہ دور تھا جب عظیم الشان مغل سمٹ کر دہلی اور اس کے اطراف تک محدود ہو گئی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں انگریزی راج کا عروج ہو رہا تھا اور الگ ملک پر قابض ہونے کے لیے ہر قسم کی سیاسی حکمت عملی سے کام لے رہے تھے۔ Everything is fair in love and war کے انگریزی مقولے کے مطابق ان کے لیے سب کچھ جائز تھا۔ ان کے جاسوس نوابوں اور اُمراء کے محلوں اور حویلیوں میں ہی نہیں

بلکہ قلعۂ معلیٰ تک میں موجود تھے اور اُنھیں ہر پل باخبر رکھتے تھے۔ ہندوستانی حکمرانوں پر انگریزوں کا غلبہ قائم کرنے میں ان جاسوسوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔"[۱۷]

یہ وہ پیچیدہ صورتحال تھی جس نے ہزاروں سال پرانی مگر شاندار علمی معیارات، ارفع روایات اور خوشحال و معیاری پیداوار کے حامل ہندوستان کو مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا تھا حالانکہ ماہرین اقتصادیات و مؤرخین یہاں تک لکھتے ہیں کہ :۔

"۱۶۰۰ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی گئی تو عالمی پیداوار میں ہندوستان کا ۲۳فیصد حصہ تھا یعنی اتنا بڑا جتنا کہ تمام یورپ کا مشترکہ حصہ تھا۔ ۱۷ویں صدی میں ۲۷فیصد۔ برطانوی قبضے کے دو سو سال بعد برطانیہ کا عالمی پیداوار میں حصہ ۱۰فیصد ہو گیا اور ہندوستان کا تین فیصد رہ گیا۔"[۱۸]

مجموعی طور پر انگریز سرکار کی آمد سے پیدا ہونے والے سیاسی، سماجی اور ثقافتی بدلاؤ کی اس صورت حال کو پورے ناول میں محتاط قدموں سے پیدا ہونے والی آہٹ کی صورت محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس میں بادشاہ ذی جاہ کو بھی یہ شعور ہو چلا تھا کہ اُن کے عین جہانبانی اور اصول حکمرانی کی بساط پر اب ایک غیر وجود متمکن پذیر ہو چلا ہے اور اُس نے اہل ہند کو باور کروانا شروع کر دیا ہے کہ اہل ہند طور طریق، رسوم و رواج اور تاریخ و افسانہ سب قابل ترمیم ہیں۔[۱۹] لہٰذا کمپنی نے شاہی ٹکسالوں میں سکے بھی ڈھالنا شروع کر دیے تھے۔ جس پر ابتدائی طور پر تو شاہ دہلی کا نام تھا لیکن ۱۸۳۵ء میں ان پر شاہ دہلی کی بجائے انگریز بادشاہ' ولیم چہارم کا نام اور چہرہ دے دیا گیا تھا۔ اسی سبب ۱۸۴۰ء کے سکوں پر ملکہ وکٹوریا نمودار ہوئی اور ملک ہند میں بادشاہ کی حکومت محض جمعہ کے خطبہ تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے اپنے اس ناول میں ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے انتہائی اہم دور کو جس تحقیقی جستجو اور افسانوی نثر پارے کی صورت پیش کیا ہے، لائق تحسین ہے۔ اِسی لیے معید رشیدی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ تاریخ ہے مگر اس کا لطف افسانے کا سا ہے۔ یہ ادبی اور تہذیبی مرقع ہے لیکن تاریخ کی بازدید بھی ہے جس میں تخلیقی جولانیاں بھی ہیں۔ حقائق کی نقاب کشائی بھی ہے اور قیاسات کی مدھم مدھم روشنی بھی۔ ناول نگار نے بحر ظلمات میں تخیل کے گھوڑے دوڑا کر گوہر آبدار بھی حاصل کیا ہے۔ یہ اس ناول کا اعجاز ہے کہ بعض تاریخی حقائق کو بھی

قاری افسانہ سمجھ کر پڑھتا ہے اور ان سے حظ اُٹھاتا ہے۔‘‘[۲۰]

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ’’کئی چاند تھے سرِ آسماں‘‘ افسانوی نثر میں وہ تاریخی بیانیہ ہے جو اپنے اندر برطانوی، ہندوستانی اور مسلم تہذیب کے امتزاج سے تشکیل پانے والے ثقافتی اور سماجی عناصر کو بخوبی ہمارے سامنے یوں پیش کر رہا ہے گویا ہم یہ پڑھ ہی نہیں رہے؛ دیکھ بھی رہے ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں (کراچی: شہرزاد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۲۱۹۔

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، اظہار تشکر، ۸۱۵۔

3. *Collins Cobuild Dictionary* (London: Haper Colins Publishers, 1992), 268.

۴۔ ڈاکٹر مبارک علی، برطانوی ہندوستان (لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۱۲-۱۳۔

۵۔ ناصر عباس نیر، ’’مابعد نو آبادیات: حدود و امتیازات‘‘، مشمولہ: ما بعد نو آبادیات، اُردو کے تناظر میں (کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء)، ۵۔

۶۔ ایضاً۔

۷۔ ناصر عباس نیر، ’’نئے استعماری بیانیے اور اُردو ادب‘‘، مشمولہ: یہ قصہ کیا ہے معنی کا (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۲۲ء)، ۲۲۔

۸۔ ڈاکٹر مبارک علی، برطانوی ہندوستان، ۱۴-۱۵۔

۹۔ ایضاً، ۱۳۴-۱۳۵۔

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ۱۸۸۔

۱۱۔ ایضاً، ۱۷۴۔

۱۲۔ ڈاکٹر مبارک علی، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ۱۳۵-۱۳۷۔

۱۳۔ ڈاکٹر احتشام علی، اُردو نظم کا نو آبادیاتی تناظر (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء)، ۱۵۔

۱۴۔ ایضاً، ۱۴۔

۱۵۔ ایضاً، ۴۵۹۔

۱۶۔ ڈاکٹر مبارک علی، آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ۳۷۔

۱۷۔ فیروز عالم، ”کئی چاند تھے سرِ آسماں، فکشن کا ایک سنگ میل“، مشمولہ : دسترس (سہ ماہی) دھنباد (جھارکھنڈ : س۔ن)، ۱۵۔۱۶۔

۱۸۔ ششی تھرو، عہد ظلمات (برصغیر میں برطانوی سلطنت)، مترجمہ : عابد محمود (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء)، ۳۹۔

۱۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کئی چاند تھے سر آسماں، ۶۸۰۔

۲۰۔ معید رشیدی، ”کئی چاند تھے سرِ آسماں : تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ“، مشمولہ : روشنائی، جلد ۴۲، ص ۲۹۔۳۰۔